

## پری ناز اور پرندے؛ 'طاؤس چمن کی مینا' کا تاریخی تسلسل

"Pari Naz Aor Parinde", The historical continuation of the "Ta'os Chaman Ki Maina"

ڈاکٹر اسد عباس عابد<sup>۱</sup> داؤد راحت<sup>۲</sup>

### Abstract:

*Naiyer Masud is a distinctive fiction writer in Urdu. His fiction does not cut us from reality. It grants us an aesthetic distance to experience the grim, gloomy and unimaginable shades of reality. This study is an attempt to analyze (Pari Naz aor parindy) as a creative continuation of Taus Chaman ki Maina. The elements of both the writings have been compared, analyzed and considered in this regard and results have been drawn to confirm this creative continuation in general.*

**Keywords:** Fiction, Creative, Continuation, Taos Chaman Ki Maina, Pari Naz Aor Parindy.

نیر مسعود اردو فکشن میں ایک منفرد حیثیت کے حامل ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا فکشن ہمیں حقیقت سے یکسر الگ نہیں کرتا، بلکہ یہ ہمیں حقیقت کی مہم، غیر معمولی اور ناقابل تصور صورتوں سے دوچار ہونے کے لیے درکار جمالیاتی فاصلہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مطالعہ "پری ناز اور پرندے" کا تجزیہ "طاؤس چمن کی مینا" کے تخلیقی تسلسل کے طور پر کرنے کی ایک سعی ہے۔ اس مضمون میں ان دونوں ادب پاروں کے متنوع عناصر کا اسی تناظر میں تقابل اور تجزیہ کیا گیا ہے اور نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

**کلیدی الفاظ:** فکشن، تخلیقی تسلسل، طاؤس چمن کی مینا، پری ناز اور پرندے۔

ایک کہانی کی موجودگی میں ایک کہانی کا قیام ایک خطرناک تجربہ ہے، یہ ثابت کرنا ہے کہ پہلی کہانی میں کیا کچھ رہ گیا ہے جو ابھی بیان کرنا ہے یا جو کہا گیا ہے وہ کس حد تک ادھورا ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے ایک مزید کہانی کو طول دینا ہے۔ پھر یہ انتظار بھی کرنا ہے کہ پہلی کہانی کے مقابلے میں لوگ کس حد تک متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ سارے سوالات اس لیے قائم ہوتے ہیں کہ "پری ناز اور پرندے" سے پہلے "طاؤس چمن کی مینا" موجود ہے۔ یہ نیر مسعود کا بہت اہم افسانہ ہے جس کی پہلی اشاعت رسالہ "سوغات" شمارہ ۷، بنگلور سے ہوئی۔ اس کے بعد یہ افسانہ "طاؤس چمن کی مینا" نام کے افسانوی مجموعے میں ۱۹۹۷ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ یہ افسانہ کچھ وجوہات کی بنا پر ایک منفرد افسانہ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ تیر مسعود نے ایک واقعہ کو یا تاریخی قصہ کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ واجد علی شاہ کے بارے میں پیدا ہونے والی کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔ مثلاً تاریخ میں ہمیں واجد علی شاہ ایک ایسے بادشاہ کے روپ میں ملتا ہے جو عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے، امتزاع سلطنت میں اس کی کاہلی اور رنگین مزاجی کا ہاتھ ہے، ہندوستان

<sup>۱</sup> ان ڈیپنڈنٹ سکالر، سرگودھا۔

<sup>۲</sup> اسکالر ہی ایچ۔ ڈی (اردو)، یونیورسٹی آف سرگودھا۔ (Corresponding Author)

کے ایسے بادشاہان کی فہرست میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار کو ختم کرنے میں خود حصہ لیا ہے۔ تاریخ میں واجد علی شاہ کے کردار کو بہت غلط انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تیر مسعود کی تحقیق کا ایک بہت اہم حوالہ واجد علی شاہ شناسی بھی ہے۔ چند مضامین جن میں "واجد علی شاہ"، "واجد علی شاہ کا بیان صفائی (جواب اودھ بلو بک"، "واجد علی شاہ پر نظر ثانی"، "مقدمہ سُخن اشرف"، "واجد علی شاہ اختر" شامل ہیں۔ واجد علی شاہ سے ہمدردی نہ صرف تیر مسعود کی تحریروں میں نظر آتی ہے بلکہ اُن کے والد محترم مسعود حسن رضوی ادیب کے ہاں بھی یہ یہی رویہ ملتا ہے۔ تو اس افسانے کی تشکیل میں تیر مسعود کا ایک باقاعدہ ارادہ یہ تھا کہ واجد علی شاہ کی شخصیت پر پڑی دھول کو دھویا جائے اور ان کی علمی، ادبی، سیاسی، انتظامی صلاحیتوں کو سامنے لایا جائے، بلکہ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

”اس کو باقاعدہ ایک مقصد سے لکھا، ورنہ کسی مقصد سے کہانی لکھنے کا قائل نہیں ہوں، وہ باتیں تھیں۔ ایک تو واجد علی شاہ کو بدنام بہت کیا گیا کہ بہت ہی بر آدمی تھا۔ اُس میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن بعض خوبیاں تھیں تو وہ اور اس سے پھر لکھنؤ، لکھنؤ سے اودھ، اودھ سے مسلم، ہندو گویا پوری جو ہماری ٹریڈیشن ہے ہندوستان کی۔ اس کے متعلق ایک امپریشن یہ ہو گیا ہے کہ بہت ہی ڈیکڈنٹ لوگ تھے، اور اگر ایسے نہ ہوتے تو انگریزوں کا قبضہ کس طرح ہو جاتا اور اب نہ ہمارے بچوں کو کچھ معلوم ہے کہ اُس وقت کیا زندگی تھی اور کیا اُس میں کوئی اچھائی بھی تھی۔ بس یہ کہ بڑے جاہل قسم کے بڑے بیک ورڈ لوگ تھے۔ تو میں نے سوچا کہ کچھ دلچسپ کہانیاں اس طرح کی لکھی جائیں کہ جن سے اندازہ بھی ہو کہ پہلے کی ٹریڈیشنز کیا تھیں اور ایک طرح کی ہمدردی اپنے ماضی سے پیدا ہو۔“ [۱]

"طاؤس چمن کی مینا" ایک افسانے کے فنی فکری لوازمات کو پورا کرتے ہوئے اختصار کا حاصل قصہ ہے جس ایک واضح تصویر ہمیں "پری ناز اور پرندے" میں نظر آتی ہے۔

"پری ناز اور پرندے" انیس اشفاق کا ناول ہے جس کی اب تک دو اشاعتیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

"پری ناز اور پرندے"۔ انیس اشفاق، اشاعت اول، جون ۲۰۱۸ء، ایڈورٹائزر۔

”پری ناز اور پرندے“۔ انیس اشفاق، اشاعت دوم، ۲۰۱۹ء، عکس پبلی کیشنز، لاہور۔

اس ناول میں بھی واجد علی شاہ کے بارے میں اسی مغالطے کو رد کرنے کی ایک شعوری کوشش کی گئی ہے، جو میسر مسعود کی واجد علی شاہ کے بارے میں تھی۔ انیس اشفاق نے واجد علی شاہ کے کردار کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ ”طاؤسِ چمن کی مینا“ سے الگ نہیں بلکہ اسی قصے کی ایک تفصیلی جہت ہے۔ واجد علی شاہ ایک ایسا بادشاہ تھا جس کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے باقاعدہ ایک منظم سازش کی، حکومتی مشینری کا استعمال ہوا دراصل واجد علی شاہ کا عہد ایسا عہد تھا جب انگریز پورے ہندوستان پر اپنے قبضے کو حتمی شکل دینا چاہتے تھے۔ انیس اشفاق نے اس ناول میں بھی واجد علی شاہ کے بارے میں کچھ ایسے حقائق ہی سامنے رکھے ہیں جس سے بادشاہ کے بارے میں پائے جانے والی غلط رائے کا زائلہ ہوتا ہے۔ مثلاً بادشاہ کی طبیعت میں پائی جانے والی رحم دلی یا رعایا کے بارے میں انصاف کی اک مثال ملاحظہ فرمائیں:

”بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی کہا تھا:

”اہل کاروں میں سے اگر کسی سبب سے کسی سے کام نکال بھی لیا گیا تو اس کی تنخواہ اور عزت باقی رہے گی۔“ [۲]

”پری ناز اور پرندے“ میں جب مرکزی کردار باباجی (حسین آبدار) سے سنی سنائی بات کہہ دی کہ بادشاہ نے ہمیں ناچ گانے کے سوا کیا دیا ہے؟ تو باباجی کہتے ہیں کہ:

”میاں سوچ کر بولا کرو مذاق وہ اڑاتے ہیں جو فرنگی کے لکھے پر یقین کرتے ہیں۔ بادشاہ نے مرتے دم تک نہ مصلیٰ چھوڑا نہ تسبیح۔ اور یہ جو سُر تال ہے یہ کس کی نس میں نہیں ہے۔ تم یہاں دریا پر کھڑے ہو۔ یہ دھوپ چلی جائے، آسمان پر بادل آجائیں، ہوا تیز چلنے لگے، پانی برسنے لگے اور یہ جو خاموش دریا ہے اس کی لہروں میں شور ہونے لگے تو یہ سب تم کو اچھا لگنے لگے گا۔ جانتے ہو کیوں؟“

”کیوں؟“

”سب ایک لے میں آجائیں گے۔ یہی لے سنگت ہے اور جان عالم اس لے پر بچپن سے فدا تھے اور ایک بات اور سمجھ جب سب کچھ لے میں ہوتا ہے تو اندر سے۔۔۔۔۔“

”ناپنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔“ [۳]

"طاؤس چمن کی مینا" میں مرکزی کردار واحد متکلم نہیں بلکہ ایک غیر تاریخی کردار کالے خاں ولد یوسف علی خاں ہے۔ اسی کی زبان سے تمام قصہ بیان کیا گیا ہے۔ تیر مسعود کے بہت سے افسانوں میں مرکزی کردار واحد متکلم رہا ہے، مگر اس افسانے کی بت میں راوی کو شعوری طور پر تبدیل کیا گیا ہے اور ایسا رسالہ "سوغات" کے ایڈیٹر محمد ایاز اور محمد عمر مین کے کہنے پر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اُن کی تمام کہانیوں کا راوی ایک ہی معلوم ہوتا تھا۔ محمد عمر مین نے اُن سے کہا تھا کہ آپ اپنے راوی کو کچھ دن کی چھٹی دے کر کشمیر بھیج دیں۔

تیر مسعود نے "طاؤس چمن کی مینا" میں جو کردار پیش کیے ہیں انیس اشفاق نے اُن کرداروں کے علاوہ بھی چند کردار متعارف کرائے ہیں جن کی وجہ سے قصے کا زیادہ حصہ جو اس وقت چھپایا گیا تھا اس کو اب یہاں بیان کیا گیا ہے۔ ان کرداروں کا تعارف ملاحظہ فرمائیں:

شاہین شہر زاد۔ (مرکزی کردار۔ عمر پچیس سال کی ہے)

فرش آرا۔ (فلک آرا کی بیٹی اور کالے خاں کی نواسی)

رام دین (بازار میں چڑیا بیچنے والا)۔ رام داس کے پوتا۔

باباجی۔ (حسین آبدار۔ کالے خاں کے ساتھ باغ میں کام کرنے والا)

خاطرہ (باباجی کی بیٹی کا نام تھا جو فوت ہو گئی تھی)

فلک آرا (کالے خاں کی بیٹی)

علی بخش (نبی بخش کا بھائی جو کرپشن کرتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ یوسف مرزا والی حویلی اسی کی۔ علی

بخش کی بیوی دیوانی ہو گئی تھی۔ بانی کے ماتم دار اسی دلہن کے بارے میں ہے)

فریہ (مرکزی شاہین شہر زاد کردار کی بہن)

ارجن ملاح (باباجی کے ساتھ جنگل میں رہتا ہے)

علی نقی خاں

یوسف مرزا۔

عالیہ بیگم (دروغہ نبی بخش کی نواسی)

مرزا (تیر مسعود کلامزم)

سکندر خاں شیش محلّی۔ گھوڑے والے کا نام

فرش آرا اور شہر زاد شاہین کی جو بیٹی ہوتی ہے اُس کا نام بھی "پری ناز" رکھا جاتا ہے۔

"طاؤس چمن کی مینا" میں جو کہانی کالے خاں بیان کرتا ہے "پری ناز اور پرندے" میں اس کہانی کا بقیہ حصہ شاہین شہر زاد، فرش آرا اور باباجی کے توسط سے پورا کیا جاتا ہے۔ ناول کی ابتدا میں مرکزی کردار واحد متکلم کے روپ میں سامنے آتا ہے، جو پرندوں کا شوقین اور اتوار کے دن وہ کچھ پنجرے خریدنے کی غرض سے بازار جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات رام دین (پرندے بیچنے والا) سے ہوتی ہے۔ اسی رام دین کی دکان پر ایک لڑکی کچھ خاص قسم کے پنجرے بیچنے آیا کرتی ہے۔ اس کے بنائے ہوئے پنجرے اس قدر نفیس ہیں کہ اس کی قدر کم کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ یہ لڑکی فلک آرا کی بیٹی ہے اور کالے خاں ولد یوسف خاں کی نواسی ہے۔ فلک آرا اور فرش آرا ماں بیٹی معاشی حالات خراب ہونے کی وجہ سے پنجرے بیچ کر اپنی گزربسر کرتی ہیں۔ یہ لکھنوی تہذیب کا ایسا ماحول ہے جہاں لین دین اور روپے پیسے کی ضرورت ابھی اس قدر نہیں کہ اقدار کو قربان کیا جائے بلکہ یہاں لوگوں کے شوق کی قدر ہے مختلف چیزوں کی تخلیق میں نفاست اور ہنرمندی کی لوگوں کو قدر ہے۔

رام دین شاہین شہر زاد اور فرش آرا کی شناسائی کی وجہ ہے، پنجرے ایک ایک کر کے شاہین شہر زاد خریدتا رہتا ہے اور رام دین فرش آرا کو شاہین شہر زاد کے بارے میں آگاہ کرتا رہتا ہے، ان پنجروں میں پہاڑی مینا ہی خوبصورت لگے گی جس کی تلاش کا وعدہ رام دین کرتا ہے۔ فرش آرا حسین کھنڈے کے پیچھے جہاں نرکلوں کا جنگل شروع ہوتا ہے وہاں کسی مکان میں رہتی ہے۔ اس سکونت کو چھپایا جاتا ہے۔ شوق مشترک ہونے کے باعث فرش آرا اور شاہین شہر زاد کے درمیان تعلق بڑھنے لگتا ہے۔ رام دین، رام داس کا پوتا ہے جو بادشاہ واجد علی شاہ کے عہد میں پرندے پکڑنے کا کام کرتا تھا اور اس زمانے کے لوگ اس جانتے

پہچانتے تھے۔ پہاڑی مینا کی تعریف کرتے کرتے رام دین ایک قصے کا ذکر بڑے رازدارانہ انداز میں کرتا ہے۔ اور تیسرے پل کے بعد کے علاقے میں رہنے والے بوڑھے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ یہ پورا قصہ تو وہی بوڑھا بتائے گا۔ یہ بوڑھا باباجی (حسین آبدار) ہیں جو کالے خاں کے ساتھ واجد علی شاہ کے باغ میں پرندوں کی دیکھ بھال پر معمور تھا۔ یہ باباجی کالے خاں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، کالے خاں کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی اور باباجی کی عمر چودہ یا سولہ سال کی تھی۔ شاہین شہر زاد پرندے دیکھنے کے شوق میں جنگل جاتا ہے اور وہاں اس کی ملاقات باباجی سے ہوتی ہے، یہاں بھی مشترک شوق کے باعث دونوں کے درمیان تعلق بڑھنے لگتا ہے۔ باباجی اس ناول میں بہت اہم کردار ہیں۔ یہی باباجی شاہین شہر زاد کو اس قصہ کو لکھنے والے کی طرف (تیر مسعود) کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ "قصہ لکھنے والا اسی شہر میں ہے اور اس نے بہت سے اور بھی قصے لکھے ہیں" باباجی بہت تجسس اور اضطراب سے رک رک کر یہ قصہ شاہین شہر زاد کو سناتے ہیں مگر کئی ملاقاتوں میں، کیونکہ قصہ میں چھپی تکلیف کو برداشت ہی نہیں کر پاتے اور نہ وہ اپنے شاندار ماضی اور ایک رحم دل بادشاہ کے اثرات سے نکل پاتے ہیں۔

طاؤس چمن میں جو کچھ ہوا حسین آبدار اس کے چشم دید تھے۔ انھیں حضور عالم (واجد علی شاہ کا وزیر) پر بہت افسوس ہے کہ اس نے بادشاہ کی سلطنت کو تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور انگریزوں کا وفادار تھا اور کالے خاں کے ساتھ بھی برا سلوک صرف حضور عالم کی وجہ سے ہوا۔

باباجی قصہ لکھنے والے کی تلاش شاہین شہر زاد کے ذمہ لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسی شہر میں کہیں رہتا ہے تم اسے تلاش کرو۔ اسی تلاش کے دوران شاہین شہر زاد فرس آرا کے گھر تک بھی پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات فلک آرا (کالے خاں کی بیٹی) سے ہوتی ہے۔ انھیں بھی پرندے پالنے کا شوق ہوتا ہے اسی وجہ سے دونوں کے درمیان خوب بات چیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد کئی بار جنگل میں باباجی سے ملاقاتوں کا سلسلہ ہے اور فرس آرا اور شہر زاد کے درمیان بھی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔ ان ملاقاتوں میں طاؤس چمن کی مینا کے قصہ گو کی تلاش اور پہاڑی مینا کی باتیں زیادہ ہیں۔

تلاش کرتے کرتے بالآخر ان کی ملاقات تیر مسعود سے ہو جاتی ہے، جب ان کی ملاقات تیر مسعود

سے ہوتی ہے اُس وقت وہ شدید بیمار ہوتے ہیں۔ یعنی یہ زمانہ ۱۹۹۶ء کے بعد کا ہے کیوں کہ اسی سال تیر مسعود ریٹائر ہوئے اور اسی سال اُن کے بھائی اختر مسعود رضوی کی وفات ہوئی اسی سال تیر مسعود بھی عارضہ دل میں مبتلا ہوئے اور پھر مسلسل بیمار رہنے لگے۔ پہلی ملاقات ان کی تیر مسعود کے بیوی اور اُن کے نوکر مرزا سے ہوتی ہے تیر مسعود شدید بیماری کی وجہ سے ملاقات نہیں کر پاتے مگر دوسری ملاقات میں وہ تیر مسعود سے ملتے ہیں۔ اس وقت تک قصہ شائع نہیں ہوا۔ یعنی لوگوں تک سینہ بہ سینہ پہنچا ہوا ہے۔ وہیں پر فرش آرا بھی اس بات کا ذکر کرتی ہیں کہ اُن کی ولدہ فلک آرا بہت بے چین رہتی ہیں کہ طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا؟ باباجی کو بہت استفسار تھا کہ قصہ جتنا لکھا گیا ہے اس سے زیادہ چھپایا گیا ہے؟ رام دین کی بھی یہی بات تھی۔ تیر مسعود وہاں یہ بات کرتے ہیں کہ جتنا قصہ میں نے سنا تھا وہ تو لکھ دیا مگر باباجی حسین آبدار کا نام اُن سے کسی نے لیا نہیں۔ اس قصہ کو تیر مسعود نے دو نشستوں میں بیان کیا ایک نشست میں تیر مسعود نے وہ سنایا جو طاؤس چمن میں ہوا اور ایک نشست میں تیر مسعود نے وہ سنایا جو ہوا تو تھا مگر تیر مسعود نے لکھا نہیں۔ اس ناول کا بنیادی مقصد بھی طاؤس چمن کی مینا کے بعد والے قصے کی ٹوہ لگانا ہے جس میں باباجی (حسین آبدار) انیس اشفاق کے دریافت شدہ کردار ہیں۔

تیر مسعود نے بڑی روانی کے ساتھ پہلی نشست مکمل کی اور دوسری نشست میں کہا کہ واجد علی شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی انگریزوں نے اُن اُن لوگوں سے پیٹنگیں بڑھانا شروع کر دیں جن کو بادشاہ کے ساتھ ملال تھا۔ بہت سارے منافق لوگ انگریزوں نے اپنے ساتھ ملا لیے۔ واجد علی شاہ کو جب حکومت اپنے والد امجد علی شاہ سے ملی تو حالات بہتر نہ تھے بطور خاص وزارت درست نہ تھی امداد حسین خاں وزیر تھے جو واجد علی شاہ کے عہد میں بھی رہے اُن کے بعد امیر الدولہ میر مہدی کو یہ عہدہ ملا وہ بھی ناکام ہوئے پھر مدار الدولہ کے پوتے نواب علی نقی خاں بہادر (حضور عالم) کو یہ عہدہ ملا۔ نواب علی نقی خاں نااہل تھا مگر اُس نے اپنی بیٹی کا نکاح بادشاہ سے کروا کر یہ رشتہ اور بھی مضبوط کر لیا۔ اب بادشاہ اُن کے اشاروں پر چلتے تھے، مگر حضور عالم ریڈیٹسی جا کر محل کی ہر بات بتانے لگے۔ آخر کار ایک لاکھ روپے کی جاگیر اور اودھ کا ایک بڑا قصبہ لینے کے لالچ میں حضور عالم نے بادشاہ سے دستخط کروانے چاہے جو نہ ہوئے، لیکن اس وقت پانی سر

سے گزر چکا تھا شہر میں معزولی کے اشتہار کی بابت ہر طرف کہرام برپا ہو گیا۔

کالے خاں فرش آرا کے نانا نہ صرف شاہی باغ میں جانوروں کے نگہ دار تھے بلکہ وہ بادشاہ سے بے حد مخلص تھے، کالے خاں کو محل کے اندر جشن عورتوں کی طرف سے اطلاعات ملتی رہتیں تھیں کالے خاں ذات کا شیدی تھا، اور کالے خاں کی ماں کا تعلق ان جشن عورتوں سے تھا۔ کالے خاں وقتاً فوقتاً حضور عالم کو جملوں سے کاٹ دیتے رہتے تھے حضور عالم نے بھی کالے خاں کے خلاف بہت زور لگایا ہوا تھا کہ کسی طرح کالے خاں کو نوکری سے نکلوایا جائے۔ دادرسی والے صندوق میں عرضیاں ڈلوائیں، پھر اپنے ماتحتوں سے بادشاہ تک شکایتیں پہنچوائیں، اسی دشمنی میں حضور عالم کو موقع مل گیا کہ کالے خاں جب اپنی بیٹی فلک آرا کی محبت میں شاہی چمن سے ایک پہاڑی مینا چرا کر گھر لے آتے ہیں، یہاں منشی امیر احمد عرضی نویس کے زورِ قلم سے کالے خاں کو نجات مل گئی بلکہ بارہ اشرفیاں بھی۔ اس کے بعد آخری حملہ سنگا جمنی کٹوریوں والا کیا گیا مقصد یہ تھا کہ کالے خاں کو جیل میں ڈالا جائے۔ جب کالے خاں جیل میں تھا اس وقت بادشاہ کو تخت سے اتار دیا گیا۔ دوسرے بہت سارے قیدیوں کے ساتھ کالے خاں کو بھی آزاد کر دیا گیا۔

کالے خاں کو یہ آزادی ایک آنکھ نہ بھائی، بلکہ وہ ملکہ عالیہ حضرت محل کے سپاہیوں میں شامل ہو کر جنگ میں لڑنا چاہتا تھا۔ کالے خاں کے جیل سے باہر آنے پر بادشاہ کلکتے جا چکے تھے۔ قیصر باغ تباہ، جانور مارے جا چکے تھے، اس سارے منظر پر کالے خاں کو بہت تکلیف ہوئی۔ جب دروغہ نبی بخش کو گولی لگنے کا پتہ چلا تو وہ بہت روئے۔ تیر مسعود کہتے ہیں کہ بتانے والے نے مجھے یہیں تک بتایا۔

اس کے بعد تیر مسعود نے افسانے کا انجام رنج و الم پر کرنے کی بجائے فلک آرا کی معصومیت پر کر دیا۔ یہ بھی لکھا کہ کالے خاں بنارس میں جا کر رہنے لگے لیکن انیس اشفاق نے اس ناول میں کالے خاں کے اصل واقعے کو بیان کیا ہے۔ انیس اشفاق اس حوالے سے بہت معتبر حوالہ ہیں کہ وہ تیر مسعود کے بہت قریبی دوست ہیں۔ تیر مسعود نے اس ملاقات میں رنج کا پہلو یوں بیان کیا ہے:

”جیل سے گھر آنے کے بعد کالے خاں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ دن بھر وہ تمھاری

ماں کو اپنی گود میں کھلاتے اور رات ہوتے ہی جب فلک آرا سو جاتیں، طاؤس چمن کی

طرف نکل جاتے اور اُس کا ملبہ کرید کر چاند کی روشنی میں اپنی چڑیوں کے پر تلاش کرتے اور یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے کہ رننے کی طرف سے بادشاہ کی چیمپی شیرنی موہنی کی آواز کب آتی ہے۔ لیکن نہ انھیں چڑیوں کے پر ملے نہ رننے کی طرف سے موہنی کی آواز آئی اور ایک دن وہیں اُن کی موت ہو گئی۔" [۱۴]

اس کے بعد ناول میں شاہین شہر زاد کو نوکری بھی تیر مسعود کی وساطت سے ملتی ہے، باباجی فرش آرا کی فرمائش پوری کرنے کے لیے پچیس پہاڑی میناؤں کو تلاش کرتا ہے۔ شاہین شہر زاد اور فرش آرا مل کر ایک چھوٹا سا قفس گھر میں بناتے ہیں جن میں چالیس میناؤں کے رہنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ شاہین شہر زاد اور فرش آرا آپس میں شادی کر لیتے ہیں۔ جب وہ "طاؤس چمن کی مینا" کا مسودہ واپس کرنے جاتے ہیں تو تیر مسعود کی وفات ہو چکی ہوتی ہے۔

یہاں تک تو "پری ناز اور پرندے" کا مرکزی خیال بیان کیا گیا ہے:

"طاؤس چمن کی مینا" کا قصہ واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے زمانے سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے زمانے تک کا ہے۔ مگر "پری ناز اور پرندے" کا قصہ اسی قصے کی بازگشت پر مبنی ہے زمانہ ۱۸۵۷ء سے لے کر تیر مسعود کی وفات ۲۴ جولائی ۲۰۱۷ء تک کا ہے۔ تیر مسعود کے ہاں "لکھنؤ" ایک بہت بڑا تخلیقی استعارہ ہے۔ "طاؤس چمن کی مینا" میں انھوں نے لکھنؤ کی معاشرت پیش کرنے میں کمال مہارت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے پس منظر میں بستوں اور شہروں کا اظہار بہت کم کیا ہے اگر کسی تہذیب اور شہر کا ذکر بہت واضح طور پر ملتا ہے تو وہ شہر لکھنؤ ہے۔ انیس اشفاق نے بھی اس ناول کی کہانی میں چند مقامات کا ذکر کیا ہے جن میں عالم باغ، نواب گنج، حسین آباد، ست کھنڈے، دریائے گو متی، کاکوری، جھانگر باغ، حیدر گنج، مہدی گنج، حسین آباد مبارک، سکندر باغ، رومی دروازہ، ایلچ خاں کے میدان، ٹوریا گنج، منشی فضل حسین، موتی جھیل اور لیچ آباد جیسے مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لکھنؤ شہر کا یہ وہ عہد ہے جہاں اہل ہنر مختلف مقامات سے اُٹھ کر صاحبِ کمال بادشاہوں کی سرپرستی میں زندگی گزارنے کے بعد بھی رہ رہے ہیں اور اپنے ناموں کے ساتھ مختلف القابات لگاتے ہیں اپنی نسلوں اور خاندانوں کی پہچان پر فخر کرتے ہیں اسی

سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ میں اُن کا قیام اس وجہ سے تھا کہ یہاں صرف اور صرف فن اور ہنرمندی کی قدر تھی۔ اس بارے میں یاسمین حمید کی ایک رائے ملاحظہ فرمائیں:

”ناول کے کرداروں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ مختلف النسل ہیں، لیکن وہ ایسا معاشرہ ہے جو وسیع النظر ہے اور رشتوں کے معاملوں میں رنگ و نسل کی قید سے ماورا نظر آتا ہے۔ فرش آرا کے نانا کالے خان شیدی تھے، فرش آرا کا اپنا باب بٹھان تھا، شاہین ایرانی نژاد ہے، جس معاشی، سماجی طبقے سے اس کہانی کے مرکزی کرداروں کا تعلق ہے، اس میں رنگ و نسل کا یہ اختلاط بھلا معلوم ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ شمالی ہندوستان میں کتنے مختلف علاقوں کے لوگ آکر بس گئے تھے۔“ [۵]

اس پورے ناول میں کئی کردار ایسے ہیں جو پرندے پالنے کے شوق سے وابستہ ہیں مثلاً شاہین شہر زاد اور فرش آرا، فلک آرا، بابا جی (حسین آبدار) تو باغ کے اجڑنے کے بعد بقیہ زندگی ہی جنگل میں پرندوں کا دانہ ڈالنے میں گزار دیتے ہیں۔ رام دین پرندے بیچنے کے پیشے سے وابستہ ہے۔ عالیہ بیگم اور پرنس یوسف مرزا بھی مینا پالنے کے شوق میں مبتلا ہیں۔ یہاں تک سکندر خان شیش محلّی بھی جو گھوڑا چلاتا ہے۔ وہ بھی پرندے پالنے کا شوق رکھتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

”آپ سب کو پرندوں سے اتنی محبت کیوں ہے؟“

”یہ محبت تو پورے لکھنؤ کو ہے۔ باہر کے لوگ پرندوں سے ہماری محبت کا مذاق اُڑاتے

ہیں۔“ فلک آرا نے تھوڑی سی ناگواری کے ساتھ کہا۔ پھر پوچھا: ”تمہیں کچھ شاعری

واعری کا شوق ہے؟“

”وہ تو ہر لکھنؤ والے کو ہے۔“ [۶]

میر انیس کا ایک شعر درج کیا گیا ہے جس میں پرندوں کی زبان کو بطور قافیہ باندھا گیا ہے:

قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یا ہو یا ہو

فاختہ کی یہ صداسرو پہ تھی کو، کو، کو

”یوسف مرزا اور اُن کی بیوی دونوں نے طرح طرح کے پرندے پالے اور بہت اچھی

طرح پالے۔ اُس علاقے میں اُن کا جانور خانہ بہت مشہور۔ جیسا دانہ وہ اپنی چڑیوں کو

کھلاتے تھے، شامی پرندوں کے علاوہ کسی اور کو میسر نہ آیا۔" بابا نے کہا۔ "کبوتروں کے پیروں میں سونے کے چھلے پڑے رہتے اور میناؤں کے پتھروں پر چاندی کے تار چڑھے رہتے۔" [۸]

یہاں تک کہ بادشاہ واجد علی شاہ بھی پرندوں کے پالنے کے شوق میں مبتلا ہیں۔ ناول میں بہت سارے مقامات پر میناؤں کے مختلف نام ہیں جن میں شبریز۔ پری ناز۔ شاپا، گل نوش، گل چشم، نٹ کھٹ زالی، دلکشاشامل ہیں۔ کچھ اور پرندوں کے نام بھی جیسے غوغیاں، کملک، فاختہ، چتر، بلبل سرا، سرخاب، بھنگے، وغیرہ بادشاہ کے باغ میں کبوتر پالنے کے بارے میں ایک اقتباس دیکھیں:

"کون کون سے کبوتر پالے تھے آپ نے۔" میں نے پوچھا۔  
 "یہ پوچھو کون سے نہیں پالے۔ گولا سے لے کر گرہ باز تک کون سا ایسا کبوتر تھا جو ہمارے یہاں نہیں تھا۔ ایک سے ایک پاموز اور ایک سے ایک شیرازی۔ نسورے ایسے کہ ان کی دم دیکھتے رہ جاؤ۔ اور غبرسے، کل دے، لوٹن، لقا اور ہرے جسے میں نے لا کر رکھے ویسے لکھنؤ میں کہیں نظر نہ آئے۔" [۹]

تیر مسعود کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے کہ وہ بھی پرندے پالنے کے شوق میں شامل ہیں۔ "نٹ کھٹ زالی" ان کی مینا کا نام ہے جو انھوں نے فرش آرا کو دی تھی۔ لکھنؤ کی تہذیب میں نہ صرف پرندوں سے دلچسپی نظر آتی ہے بلکہ بہت سارے عام لوگ بھی کئی مشاغل سے وابستہ ہیں جن میں باغبانی، طب، صابن بنانا، کیمیاگری، پتنگ بنانا، شکار، پتھروں کی اقسام سے دلچسپی، علم رمل، جلدی سازی، ہاتھوں بیل بوٹے بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح کے مشاغل سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تہذیب اپنی جمالیات کی بدولت کتنی توانا تھی۔ انیس اشفاق نے اس ناول میں کچھ ایسے مشاغل کی طرف اشارہ کیا ہے ایک اقتباس دیکھیں:

"جس کشتی میں وہ چائے لے کر آئی تھیں، میں نے دیکھا اس میں مور کی تصویر بنی ہوئی تھی اور کشتی میں جو پیا لیاں رکھی تھیں وہ بھی پرندوں کی شکل کی تھیں۔ میں نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا: "بہت خوبصورت بنی ہیں۔"

”اماں نے بنائی ہیں۔ چلنی مٹی سے اور بھٹی بنا کر انھیں پکا بھی لیا اور اُن پر رنگت بھی چڑھا دیا۔“ پنجروں کے ساتھ ساتھ آپ یہ کام بھی کر لیتی ہیں۔“ [۱]

انیس اشفاق نے تیر مسعود کے ذکر میں اُن کے ہاں بطخیں پالنے کے شوق کے بارے میں بات کی ہے، جلد سازی کے بارے میں بات کی ہے، عطر بنانے کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ لکھنؤ کی تہذیب ہے جہاں ہر طرف فن کی قدر ہے، بڑے فن کار ہیں اور پیشہ ور ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں انیس اشفاق لکھتے ہیں کہ یہ لکھنؤ اس قدر میزبان ہے کہ باہر سے آنے والے پرندوں کے لیے یہاں کے پرندے بھی اوپر کی شاخیں چھوڑ کر نیچے آجاتے ہیں۔

تیر مسعود نے ”طاؤس چمن کی مینا“ میں کرداروں کی جو زبان استعمال کی ہے۔ یہاں ”پری ناز اور پرندے“ میں بھی اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا ہے کسی قصہ کی بہتر تفہیم کے لیے یہ بہت ضروری سلیقہ ہے۔ ”طاؤس چمن کی مینا“ میں دیکھیں:

”ہم سب ہوشیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے میر داؤد کی آواز سنائی دی:

”پھر کہتا ہوں، سبق کے بیچ میں کوئی نہ بولے، نہیں جانور ہنٹ جائیں گے۔“ [۱]

اب اسی طرح کی مثال ہمیں ”پری ناز اور پرندے“ میں بھی نظر آتی ہے:

”دیکھو جروں دیکھو۔ چڑیا دن بھر ڈالی پر آتی جاتی رہتی ہے۔“ لکڑہارا بولا۔ پھر بولا: ”آگے

جنگل گھنا ہے۔ وہاں چڑی مار جاں بچھائے ہوں گے۔ جس طرف وہ جاں بچھا ہوا

طر پھ مت جانا۔“

”کیوں؟“

”چڑیا ہنٹ جائے گی اور چڑی مار تم پر کھفا ہوں گے۔“ [۱]

اس تقابلی مطالعے کے بعد یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انیس اشفاق نے تیر مسعود کے آخری ایام بطور خاص جب وہ بیمار ہوئے ۱۹۹۶ء کے بعد کے حالات کا بھی سرسری سا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس ناول میں اختتام کو بہت جلد سمیٹ دیا گیا ہے۔ مثلاً شاہین شہزاد اور فرس آرا پورے ناول میں کئی بار ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اُن کے دل میں جو محبت پھوٹی ہے اُس کو قصہ کی تلاش کے تابع رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ

اُن کی کئی ملاقاتیں بہت تنہائی میں ہیں مگر وہ قصہ گو کی تلاش، باباجی اور پرندوں کی باتوں پر مبنی ہے۔ ناول میں یہاں تک کی منزل پر ان کی محبت بھی پروان چڑھ چکی ہوتی ہے، مگر وہ اپنی ذاتی زندگی کے جذبات کا اظہار بہت کم کرتے ہیں، جو غیر حقیقی محسوس ہوتا ہے معاشرے میں اس طرح کی ملاقاتیں پیار محبت کے معاملات ہونے پر ہی قابلِ قدر اور فطری محسوس ہوتی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اختتام میں اُن کی شادی باباجی کی لکھی ہوئی ایک نصیحت کے تحت ہو جاتی ہے پہلی بار جب وہ دونوں تیر مسعود کو ملنے جاتے ہیں تو اُس وقت "طاؤس چمن کی مینا" کا افسانہ شائع نہیں ہوا ہوتا۔ جب وہ دوسری بار ملنے جاتے ہیں تو اُس وقت تیر مسعود کی وفات ہو چکی ہوتی ہے یعنی ۲۰۱۷ء میں۔ یہ سارا زمانہ ۱۹۹۶ء سے لے کر ۲۰۱۷ء تک تقریباً انیس بیس سال کا زمانہ ایک جملے میں نمٹا دیا جاتا ہے کہ "جو کتاب تم کچھلی بار دے گئے تھے وہ فلک آرا کے قصے والی، جب وہ چھاپے خانے سے آئی تو بیٹیا کو بہت یاد کیا۔ کہنے لگے پہلی کتاب اسی کو دوں گا۔" یہاں یہ گمان ہوتا ہے کہ "طاؤس چمن کی مینا" کی پہلی اشاعت تو ۱۹۹۷ء میں ہوئی اور تیر مسعود کی وفات ۲۰۱۷ء میں ہوئی، دوسری ملاقات میں جب وہ شاہین شہر زاد اور فرش آرا کو مسودہ دیتے ہیں تو اس کی اشاعت نہیں ہوئی ہوتی جب وہ یہ مسودہ دینے جاتے ہیں تو تیر صاحب فوت ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ پہرہ ذرا وضاحت طلب تھا جسے ایک جملے میں نمٹا دیا گیا ہے کہ پہلی اشاعت کے بعد تیر مسعود کی خواہش تھی کہ پہلی کتاب بیٹیا کو دیتے۔

اس ناول میں تیر مسعود کی فن کارانہ عظمت کا اعتراف بھی باباجی کی زبان سے کروایا گیا ہے۔ اُن کے کئی دوسرے قصے جن میں "سیمیا"، "مارگیر"، "پاک ناموں والا پتھر" اور بائی کے ماتم دار کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں جس میں تیر مسعود کی تعریف کا پہلو بھی سامنے آتا ہے:

”قصہ بنتا کیسے ہے۔“

”کیسے بنتا ہے؟“

”بنانے سے۔ قصہ بنا نا سب کو نہیں آتا اور بنا کر اس کا یقین دلانا بھی سب کو نہیں آتا۔ اس

کے لیے حکمت چاہیے۔“ بابا نے کہا۔ پھر بولے: ”اور یہ جو کالے خاں کا قصہ لکھنے والا ہے

یہ بڑا حکمتی ہے۔“ [۳]

ناول میں کسی کسی مقام پر فلپش بیک کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ماضی اور حال کے سنگم سے قصے کی بنت سامنے آتی ہے۔ کردار بہت جدید دور میں زندگی گزار رہے ہیں، مگر طاؤس چمن کی باقیات سے ایک رشتہ برقرار رکھنے کے لیے بڑی کامیابی کے ساتھ حال سے کسی کسی وقت ماضی میں جھانکا گیا ہے۔ مقامات، محلے، راستے، جنگل، محل، وہی رکھے گئے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے واجد علی شاہ کے زمانے میں تھے۔ تیر مسعود خود تو عصر حاضر کے افسانہ نگار تھے مگر انھوں نے تاریخی افسانہ لکھنے کے لیے جس طرح ایک واقعہ کو افسانہ بنانے کے لیے اپنے فن کو استعمال کیا ہے، یہاں تیر مسعود کے ساتھ اور تیر مسعود کی اُس تاریخی پر وچ کے ساتھ مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وہ ماحول جو افسانے میں پیش کیا گیا اُس سے آگے کی کہانی اس ناول میں پیش کی گئی لہذا افسانے اور ناول میں قصے کے تسلسل میں بہت توازن ہے۔

افسانے کا اختتام فلک آرا کے معصومانہ سوالات پر کیا گیا ہے جب کہ ناول کا اختتام رنج و الم پر کیا گیا ہے جس میں تیر مسعود کی وفات ہے، باباجی کی موت ہے کالے خاں کی موت ہے۔

حوالہ جات:

- ۱۔ ساگری سین گپتا، ”تیر مسعود سے ایک گفتگو“، مضمولہ: شب خون، شماره ۲۶۶، جلد ۳۳ (الہ آباد: مئی جون ۱۹۹۹ء)، ۳۹۔
- ۲۔ انیس اشفاق، پری ناز اور پرندے (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۹۴۔
- ۳۔ ایضاً، ۹۵۔ ۲۔ ایضاً، ۲۴۔
- ۵۔ یاسمین حمید، ”انیس اشفاق کا ناول ”پری ناز اور پرندے“، مضمولہ: مکالمہ، کتابی سلسلہ ۶۵ (کراچی: اکادمی بازیافت، ستمبر تا جون ۲۰۲۳ء)، ۲۹۶۔
- ۶۔ انیس اشفاق، پری ناز اور پرندے (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۸۱۔
- ۷۔ ایضاً، ۸۲۔ ۸۔ ایضاً، ۱۴۰۔ ۹۔ ایضاً، ۱۱۸۔ ۱۰۔ ایضاً، ۷۸۔
- ۱۱۔ تیر مسعود، طاؤس چمن کی مینا (کراچی: آج کی کتابیں، دوسری اشاعت، ۲۰۱۸ء)، ۱۶۴۔
- ۱۲۔ انیس اشفاق، پری ناز اور پرندے (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۲۲۔
- ۱۳۔ ایضاً، ۶۸۔